امجد اسلام امجد کی نظمیں-رومان سے انقلاب تک

ڈاکٹر محمد کامران، پروفیسر،شعبۂ اُردو، جامعہ پنجاب،لاہور

Abstract

Amjad Islam Amjad is one of most popular Pakistani poet. He is known for his beautiful romantic poetry but with the passage of time he depicted social problems and injustice in his poetry. This article discusses that his poetry is mixture of romantic and revolutionary thoughts.

جس طرح افسانہ مغربی ادب سے اردو کی قلم رو میں داخل ہوا،مگر داستانوں، حکایتوں اور لوک قصوں کی شکل میں ایک روایت پہلے سے موجود تھی، اسی طرح دکن میں مثنوی اور مرثیے کے روپ میں یا معمولات و رسوماتِ حیات کے حوالے سے نظم کی ابتدائی روایت پہلے سے موجود تھی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صنف کی حیثیت سے نظم کے مزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نظم کا لفظ کئی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، جب ہم نظم ونثر کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو نظم سے مراد جملہ شعری اصناف بشمول غزل ہوتی ہے جب کہ ہم غزل و نظم لکھتے ہیں تو نظم کا مفہوم ایسی اصنافِ شاعری ہوتا ہے جن کے اشعار یا مصرعوں میں معنوی ربط پایا جائے جب کہ غزل سے مراد ایسی صنف ہوتی ہے جس کا ہر شعر اپنی جگہ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ایک شعر کا دوسرے شعروں سے معنوی ربط ضروری نہیں، ان معنوں میں تمام غیر غزلیہ اصناف کو نظم کہ دیا جاتا ہے مگر اب کچھ عرصے سے نظم کی اصطلاح سے مراد ایسی شاعری ہے جس میں اوّل سے آخر تک کوئی مرکزی خیال پایا جائے۔''(۱)

جدید اردو نظم فن، ہیئت، اسلوب اور سماجی شعور کی گزرگاہوں سے ہوتی ہوئی آج اردو کی ایک معتبر صنف بن چکی ہے۔

امجد اسلام امجد سماجی شعور کے راستے زندگی کی اعلیٰ اور دائمی اقدار کے گرد دائرے بناتے ہوئے زندگی اور فن کو یک جا کر دیتے ہیں۔امجد اسلام امجد مقبول شاعر ہیں۔''مقبول شعرا'' کا ''اعزاز'' حاصل کرنے والوں کے بارے میں عمومی تاثر یہی ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ اور تعلقاتِ عامہ کا فن ان کے تخلیقی ضعف کو توانائی عطا کرکے ہر خاص

وعام کے دل کی دھڑکن بنا دیتا ہے۔تنقیدی تساہل پسندی کی اسی روایت نے ساحر کی شاعری کو صرف ایک ہی زاویے سے دیکھا،قتیل شفائی کی مقبولیت کو فلمی شاعری کی عطا قرار دے کر انھیں ''ٹھکانے'' لگا دیا گیا__ فراز کو ٹین ایجرز کا شاعر قرار دے کر انھیں ٹین ایجرز کے سپرد کر دیا گیا،یہی سلوک معاصر تنقید امجد اسلام امجد کے ساتھ کر رہی ہے۔

رومانی طرزِ احساس تو فکری ارتقا کے سفر کا اولین سنگِ میل ہے۔ن-م راشد اور فیض کی ابتدائی نظمیں، رومانی طرزِ احساس کی خوب صورت مثالیں قرار دی جا سکتی ہیں۔خاص طور پر فیض کی ابتدائے شباب کی نظمیں حریری گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی،خواب سے پُر اور لذّت سے سرشار تصویروں سے بھری پڑی ہیں۔''(۲)

امجد اسلام امجد کو بھی اردو کے کم و بیش سبھی نقادوں نے ''رومانی طرزِ احساس کا حامل مقبول شاعر'' قرار دیا یا زیادہ سے زیادہ ''از رہِ قدر دانی و سرپرستی'' ان کے فن کو ارتقا پذیر قرار دے گیا۔مگر ان کی نظموں کی کلیات ''میرے بھی ہیں کچھ خواب'' کچھ اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔

امجد کی نظموں میں بھی حریری گلابی ملبوسوں میں لپٹی خواب ناک تصویریں،خواہشِ وصال کے آئینے میں منعکس ہو رہی ہیں،مثلاً اپنی نظم ''خواہش کی حد'' میں لکھتے ہیں:

تم اگر راستے میں مل جاؤ
زندگی کا سفر سپھل ہو جائے
مسئلہ خواہشوں کا حل ہو جائے (۳)

اسی طرح ایک اور نظم ''بہت اچھا تو لگتا ہے'' بلاواسطہ اظہار کی ایک مؤثر مثال قرار دی جا سکتی ہے:

بہت اچھا تو لگتا ہے!
اچانک اس طرح دل کا محبت آشنا ہونا
دوبارہ مبتلا ہونا (۴)

امجد اسلام امجد کی نظموں میں عورت رنگوں،خوشبوؤں،تبسم،تکلم اور ہجر و وصال کی کیفیات سے عبارت ہے۔ان کے ہاں عورت کا تصور،ایک خوشنما،خوش رنگ پھولوں سے بھری بیل جیسا ہے جو مرد کے وجود کے شجر پر پھیلتی ہے تو پھیلتی چلی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا رجحانات روایتی ہیں اور امجد نے بھی انہی کیفیات کا بیان کرنے کی کوشش کی ہے مگر امجد کے طرزِ احساس اور قوتِ تخلیق کے پس پردہ صناعی کی بے مثال صلاحیت موجود ہے۔اس لیے وہ روایتی موضوعات میں بھی انفرادیت کے گلہائے رنگ و بو سجا کر میلہ لُوٹنے کا ہنر جانتے ہیں۔مثلاً ''بے وفائی'' ایک ایسا مسئلہ ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے اور ابد تک جاری رہے گا__ امجد نے اپنی نظم ''بے وفائی کی مشکلیں'' میں ایک نیا زاویہ تلاش کیا ہے:

ستارے جن کی آنکھوں نے ہمیں اک ساتھ دیکھا تھا
گواہی دینے آئیں گے

پرانے کاغذوں کی بالکونی سے بہت سے لفظ جھانکیں گے
تمھیں واپس بلائیں گے
کئی وعدے، فسادی قرض خواہوں کی طرح رستے میں روکیں گے
تمھیں دامن سے پکڑیں گے
تمھاری جان کھائیں گے
چھپا کر کس طرح چہرہ
بھری محفل سے نکلو گے!
ذرا پھر سوچ لو جاناں،
نکل تو جاؤ گے شاید
مگر مشکل سے نکلو گے(۵)

امجد نے جہاں محبت کے نغمے چھیڑے ہیں، ہجر ووصال کے قصے سنائیں ہیں، حسنِ جاناں کی مدح سرائی کی ہے، امید کے نخلستانوں کے ٹھنڈے میٹھے چشموں سے کشتِ جاں کو سیراب کیا ہے، وہاں زندگی کے بے آب صحرا میں آبلہ پائی سے کانٹوں کی پیاس بھی بجھائی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ ''رومانی طرز احساس'' سے گریز اختیار کرتے ہوئے سماجی شعور کے راستے زندگی کی اعلیٰ اور دائمی اقدار کے گرد دائرے بناتے ہوئے زندگی اور فن کو یک جا کر دیتے ہیں۔

ان کی نظموں میں غنائیت کی ایک خاص ادا اور تہذیبی رچاؤ کی ایک ایسی صفت ہے جو کلاسیکی شعری ورثے سے محبت کرنے والوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ امجد نے کلاسیکی شعری روایت کے اسالیب اور رنگ و آہنگ کو اپنے طرزِ احساس اور تخلیقی تجربات سے ہم آہنگ کر کے جو لہجہ اپنایا ہے اس کے باعث روحِ عصر، ان کی نظمیں میں جدیدیت کے قالب میں ڈھل کر سامنے آ گئی ہے۔ جدیدیت کی ہمارے نقادوں نے مختلف تعبیرات کی ہیں۔ جدیدیت کے مفہوم کے تعین کے ضمن میں ''نیا پن'' پرانا ہو چکا، شمس الرحمٰن فاروقی اور دوسرے معاصر نقادوں کی آرا کا خلاصہ کرتے ہوئے معراج انور خاں اپنے پی ایچ-ڈی کے مقالے میں لکھتے ہیں:

''....جدیدیت کچھ مخصوص رجحانات و میلانات کی حامل ایک ادبی تحریک ہے، جس کی اساس وجودی فکر پر قائم ہے، اس لیے جدید شاعری انھیں رجحانات و میلانات کے تخلیقی اظہار سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کی توثیق کرتی ہے جو وجودی فکر کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں، یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ وجودی فکر میں انسانی وجود محترم و مقدم ہے اور اسی کو تمام تجربوں اور مشاہدوں کی آماجگاہ تسلیم کیا گیا ہے، لہٰذا جدید شاعری میں انسانی وجود کو مرکزیت حاصل ہے۔''(۶)

گویا جدید شاعری، دورِ جدید کے انسانی وجود سے جڑے معاملات و مسائل کا احاطہ کرتی ہے، عصرِ حاضر کے مسائل کا بڑا سبب مادی اور میکانکی تہذیب ہے جس کی کوکھ سے مغائرت، خوف، عدمِ تحفظ، تنہائی، روحانی دیوالیہ

پن اور سب سے بڑھ کر شناخت کے بحران نے جنم لیا ہے۔ معاصر شاعری میں امجد اسلام امجد، ان معنوں میں جدیدیت پسند ہیں کہ انھوں نے روایت کی روشنی میں عصرِ حاضر کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ___ ''برزخ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''.....شاعری میرے نزدیک روایت میں موجود امکانات کی یافت کا عمل ہے، لیکن یہ عمل ہوا میں انجام نہیں پاتا، اس کے لیے شاعر کا اپنے معاشرے میں تشخص ایک لازمی شرط ہے۔ میں ذاتی طور پر فن اور زندگی دونوں کے متعلق معتدل لیکن حق پرستانہ رویے کا حامی ہوں، میں داخلیت کے خلاف نہیں، لیکن معاشرے سے کٹ کر اپنے خول میں محدود ہو جانے کو میں تخلیقی فنکار کی ناکامی سمجھتا ہوں، معاشرے کے ترقی پسندانہ، سچے اور ظلم کے خلاف برسرِ پیکار رویوں سے کومٹ کیے بغیر کوئی فنکار صحیح معنوں میں تخلیق کار کہلانے کا حق دار نہیں۔''(۷)

رومانی طرزِ احساس، امجد کی شاعری کا ایک اہم جزو ہے، اور نوجوان طبقے میں ان کی مقبولیت کا بڑا سبب، انھوں نے زندگی کے میلے اور خواہشوں کے ریلے میں، خوابوں اور جذبوں کی ان گنت کہانیاں سنائیں مگر ان کا فن کسی ایک مقام کا اسیر نہیں ہوا، وقت کی روانی نے انھیں ارتقا کے بے انت سمندر کا مسافر بنا دیا ___ اسی لیے انھوں نے انسان دوستی اور اس کے آفاقی پیغام کی صداقت کو حرزِ جہاں بنا لیا، جو تمام مذاہب کے بنیادی فلسفے کو پیش کرتا ہے، جسے راہِ سلوک کے مسافروں نے اپنی قوت بنایا، جس کے داعی میرؔ، غالبؔ سے اقبالؔ و فیضؔ تک تمام بڑے شاعر تھے، اور جس کے بغیر ذات سے کائنات تک کا سفر مکمل نہیں ہو سکتا۔ عارف عبدالمتین، امجد اسلام امجد کی انسان دوستی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''امجد اسلام امجد کی انسان دوستی نے اسے تمام ممالک کے عوام سے محبت کرنا سکھایا....اور اس کی حب وطن نے اسے اپنی دھرتی کے باسیوں سے پیار کرنے کا درس دیا ہے اور ان کے دکھ سکھ میں شرکت کی توفیق ارزانی کی ہے۔''(۸)

امجد اسلام امجد ایک آدرش پرست تخلیق کار کی طرح اس خاک داں میں محبت کی خوشبو پھیلنے کا خواب دیکھتے ہیں:

اسی خاک داں میں وہ خواب ہے
جسے شکل دینے کے واسطے
یہ جوشش جہات کا کھیل ہے، یہ رواں ہوا
اسی روشنی سے ''مکاں'' بنا، اسی روشنی سے ''زماں'' ہوا
یہ جو ہر گماں کا یقین ہے
وہ جو ہر یقین کا گمان تھا

اسی داستان کا بیان تھا۔‘‘(۹)

امجد، احساسِ زیاں کو کسی بھی قوم کا اثاثہ سمجھتے ہیں، کیوں کہ احساسِ زیاں ہی نئی تعمیر اور اصلاحِ احوال کا شعور عطا کرتا ہے چاہے وہ سقوطِ ڈھاکا کا سانحہ ہو یا اجتماعی غفلت کا جرم:

اے زمیں ہم نے تیری
حفاظت نہ کی
ہم گنہگار ہیں ، ہم گنہگار ہیں (۱۰)

امجد دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کے حق میں کلمۂ حق بلند کرتے ہیں، خاص طور پر امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے، بقول پروفیسر فتح محمد ملک:

’’امجد کی مظلوم اور محکوم مسلمانوں سے اٹوٹ وابستگی ان کی گہری انسان دوستی ہی کا ثبوت ہے۔‘‘(۱۱)

نظم ’’بیت المقدس کی ایک شام‘‘ میں شام جہاں زوال کے استعارے کے طور پر سامنے آتی ہے وہاں یہ نظم امتِ مسلمہ کے اجتماعی ضمیر کے لیے بہت سے سوالات بھی چھوڑ جاتی ہے، جن میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس مقدس سرزمین پر کب آزادی اور مہر ومحبت کی نئی صبح طلوع ہو گی اور کب امتِ مسلمہ کا مقتدر طبقہ سطحی مفادات اور مصلحت پسندی کے جال سے نکل کر اقبال کے خوابوں کو تعبیر کی نعمت سے سرفراز کرے گا:

’’میں اس شہرِ اقدس کے باہر کھڑا ہوں
کہ جس کی فصیلوں میں میرے لہو کے دیے جل رہے ہیں
ہوا تیز چلنے لگی ہے
سپاہی نے دروازے پر قفل ڈالا ہے
بندوق لہرا کے مجھ سے کہا ہے
’’چلو شام ہونے لگی ہے، چلو! اپنی بستی میں جاؤ
کہ یہ شہرِ اقدس تمھارے لیے شہرِ ممنوع ہے‘‘
اور میں سوچتا ہوں
درِ شہرِ اقدس کے باہر کھڑا میں یہی سوچتا ہوں
کہاں تک یہ ذلت کی اور غم کی آتش
مرے دل ہی دل میں سلگتی رہے گی!!
گھنی شام کی یہ گھنیری اداسی
کہاں تک مرے ساتھ چلتی رہے گی!(۱۲)

نائن الیون کے حادثے نے جہاں امریکا کے نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کی راہ ہموار کی وہاں دنیا بھر کے

مسلمانوں کو جرمِ ضعیفی کی پاداش میں پابہ زنجیر کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا__ نائن الیون کا حادثہ ایک طویل عرصے تک اسرار کی گہری دھند میں چھپا رہا۔ آج غیر جانبدار اور باضمیر مبصرین اور محققین، اسے صہونی و امریکی سازش قرار دے کر مذکورہ حادثے کے پس پردہ حقائق کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ امجد نے مذکورہ واقعے کے حوالے سے جس ردِعمل کا اظہار کیا ہے، وہ عالمی ضمیر کے لیے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتا ہے:

گیارہ ستمبر کو جو پیش آیا
بظاہر وہ سب ایک رازِ نہاں ہے
دھند لکے میں الجھی ہوئی داستاں ہے
مگر غور کرنے سے یہ بھی کھلے گا
کہ ایسی تباہی کی گھمبیر سازش
اُسامہ کے بس میں نہ تھی اور نہ ہو گی
کہے کون اس سے کہ اس کا اُسامہ
اسی کی حفاظت میں بیٹھا ہوا ہے۔'' (۱۳)

اسی طرح نظم ''بوسنیا'' بھی امتِ مسلمہ کے حوالے سے ''شہر آشوب'' کا رنگ لیے ہوئے ہے:

دھندلایا ہوا چہرہ، اس ملتِ بیضا کا
اتنا نہ ہوا ہو گا
تاریخ کی گلیوں میں مسلم کا لہو اراں
اتنا نہ ہوا گا!! (۱۴)

امجد اسلام امجد نے جہاں حسن و عشق اور انسان دوستی کے نغمے گائے ہیں، وہاں عالمی سطح پر ناانصافی، استحصال، رنگ و نسل کی تفریق، سماجی عدم توازن، خوف و جبر اور عالمی سازشوں کے خلاف آواز بلند کر کے خاموش لبوں کو قوتِ گویائی عطا کی ہے۔ اس حوالے سے امجد کی انفرادیت اس امر میں مضمر ہے کہ انھوں نے کسی مسلک، رجحان یا ''دائیں، بائیں'' والوں کے رجحانات کی چھتری تلے پناہ لینے کی بجائے آسماں کی چھت تلے بسرام کیا ہے__ اسی لیے ان کی نظمیں قلب و نظر میں اترتی چلی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر ناہید قاسمی، امجد کی نظموں میں شعور کی فراوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''امجد اسلام امجد، زندگی کے شاعر ہیں، ان کا نظریۂ حیات ان کی فطرت نگاری سے بھی جھلکتا ہے۔ وہ زندگی کو ہر رُخ سے دیکھتے ہیں لیکن اہمیت روشن پہلو ہی کو دیتے ہیں۔'' (۱۵)

امجد، نہ تو رومانوی شاعروں کی طرح خوابوں کی سوداگری کرتے ہیں اور نہ ہی ترقی پسندوں کی طرح اماوس کی راتوں کے خاتمے کو کسی مخصوص نظامِ فکر سے مشروط کرتے ہیں۔ وہ انسانی مسائل کا تجزیہ دانشورانہ سطح پر

کرتے ہیں اور زندگی کے حوالے سے امید اور رجائیت کے چراغ ہمیشہ فروزاں رکھتے ہیں۔ اپنی نظم ''سمے کی صدا'' میں وہ چپ چاپ ظلم سہنے کو ظالم کی حمایت کے مترادف قرار دیتے ہیں:

ظلم کے سامنے سر اٹھانے میں ہی
ظلم کی موت ہے
یہ سمے کی صدا ہے، سنو، دوستو (۱۶)

امجد کو جہاں ''دشمنوں'' کی خبر ہے وہاں دوستوں کا بھی پتا ہے۔ چین کے حوالے سے لکھی گئی نظموں میں جہاں پاک، چین دوستی کے چشمے ابل رہے ہیں وہاں چین کی عظمت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اہلِ پاکستان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے:

نگاہِ شاعرِ مشرق کی پیش بینی نے
ہمالیہ کے جو چشمے ابلتے دیکھے تھے
نمو کے جوش نے دریا بنا دیا ہے انھیں
ہر ایک آنکھ میں ٹھہرے تھے جتنے خواب گراں
نگارِ صبح کا چہرہ بنا دیا ہے انھیں (۱۷)

بیسویں صدی کی اردو نظم میں انقلابی طرزِ احساس کی روایت اقبال، جوش، ساحر، فیض، راشد، مجید امجد، فراز، محسن نقوی، منیر نیازی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ سے ہوتی ہوئی امجد اسلام امجد تک پہنچی تو وقت کے پُلوں تلے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا، دنیا تغیر و انقلاب کے بہت سے تجربوں سے گزر چکی تھی___ مگر ظالم و مظلوم، طاقتور اور کمزور کے مابین جاری کشمکش اسی طرح جاری و ساری ہے کیوں کہ روزِ ازل سے ''جس کی لاٹھی، اس کی بھینس'' کا اصول حاوی رہا ہے___ اکیسویں صدی اپنے جلو میں شعور کے متنوع زاویے لیے طلوع ہوئی مگر قوت کے عالمی مراکز اسی طرح غلاموں کی تجارت پر مامور نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ نام نہاد دانشوروں کی ایک بڑی کھیپ بھی غلام سازی کے اس عمل میں ''ہراول دستے'' کا کردار ادا کر رہی ہے۔ امجد نے ''اکیسویں صدی کے لیے ایک نظم'' میں اسی المیے کو موضوع بنایا ہے:

ہماری قسمت کے زائچوں کو بنانے والا کوئی ہو شاید
پر ان کا مطلب بتانے والا کوئی نہیں ہے،
دلوں میں پھندے ہیں
اور آنکھوں میں شامِ زنداں کی بے کسی ہے
چراغ سارے بجھے پڑے ہیں، جلانے والا کوئی نہیں ہے (۱۸)

امجد نے اپنی نظم ''گرتی ہوئی دیوار'' میں جبرِ مسلسل کی نہ ختم ہوالی داستان سنائی ہے۔ آزادی و بیداری کے خواب دیکھنے والی آنکھیں بے نور ہو گئیں مگر وہ خواب جاوداں ہے کیوں کہ ہر نسل آنے والی نسل کو ورثے میں یہی

خواب منتقل کرتی ہے:

پرانی ہے بہت یہ داستاں جبرِ مسلسل کی
مرے آبا نے بھی ایسے بہت سے خواب دیکھے ہیں
کہ زنجیریں پگھلتی ہیں
گلے کے آہنی طوقوں کی بندش نرم پڑتی ہے
تو آوازیں سنورتی ہیں
صدائیں جن کو سن کر یوں درِ زندان کھلتے ہیں
کہ جیسے پھول کھلتے ہیں (۱۹)

امجد اسلام امجد جہاں انسانی تاریخ سے درسِ عبرت حاصل کرتے ہیں وہاں معاصر زندگی سے بھی شعور کی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ منور اختر کے بقول:

> ''امجد اسلام امجد نے ہمارے دور کی داخلی تاریخ اپنی نظموں میں رقم کی ہے۔ ہمارے دور کی منافقتیں، ریاکاریاں، دہرا معیار، تضادات اور منفی اقدار، ان سب کا حوالہ، ان کی نظموں میں بارہا ملتا ہے، اس لیے ان کی شاعری کے موضوعات محض روایتی نہیں بلکہ واقعاتی ہیں۔'' (۲۰)

امجد کے ہاں رومانوی طرزِ احساس ضرور ملتا ہے مگر وہ روایتی معنوں میں رومانوی شاعر قرار نہیں دیے جا سکتے کیوں کہ نہ تو وہ ناسٹلجیا کے ''شوق'' میں مبتلا ہیں، نہ ہی وہ زندگی کے حقائق سے فراریت میں آسودگی تلاش کرتے ہیں، ان کی شاعری میں حسن وعشق ، ہجر اور تنہائی کی کلفتوں کا بیان بھی ہے اور وصل کی خوابناک ساعتوں کے قصے بھی ___ مگر کسی بھی مقام پر یہ کیفیات غیر صحت مندانہ (مریضانہ) قرار نہیں دی جا سکتیں ___ اگر امجد انھیں ''مقاماتِ آہ وفغاں'' کے اسیر ہو کر رہ جائے تو بہت سے دوسرے اردو شعرا کی طرح فکری بلوغت سے محروم ہو جائے، مگر انھوں نے فکر کی ایک جست سے ارتقا کی ان بیکراں رفعتوں تک رسائی حاصل کر لی ہے جسے معاصر شاعری میں ایک منفرد واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سماجی شعور کی جتنی جہتیں ان کی نظموں میں اجاگر ہوتے ہیں، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

''علی ذیشان کے لیے ایک نظم'' میں وہ جنریشن گیپ کی کہانی سنا رہے ہیں:

میرے بیٹے نے آنکھیں اک نئی دنیا میں کھولی ہیں
اسے وہ خواب کیسے دوں؟
جنھیں تعبیر کرنے میں مری یہ عمر گزری ہے (۲۱)

نظم ''سیلف میڈ کا المیہ'' بھی بے شمار لوگوں کا المیہ ہے جسے امجد نے بڑے مؤثر پیرائے میں منظوم کر دیا ہے:

زندگی کے دامن میں جس قدر بھی خوشیاں ہیں
سب ہی ہاتھ آتی ہیں

سب ہی مل بھی جاتی ہیں
وقت پر نہیں ملتیں، وقت پر نہیں آتیں
یعنی ان کو محنت کا اجر مل تو جاتا ہے
لیکن اس طرح جیسے
قرض کی رقم کوئی قسط، قسط ہو جائے
اصل جو عبارت ہو ''پس نوشت'' ہو جائے (۲۲)

شمس الرحمٰن فاروقی، شاعری کو انفرادی تجربے اور احساس کا اظہار قرار دیتے ہیں (۲۳) اس نقطہ نظر سے امجد اسلام امجد کی نظموں کی کلیات ''میرے بھی ہیں کچھ خواب'' کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں روایت کی خوشبو کے ساتھ ساتھ شاعر کے انفرادی تجربے اور احساس کا اظہار نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔شاعری میں انفرادی تجربے اور احساس کی آنچ اس وقت جاگتی ہے، جب شاعر براہِ راست زندگی کے سرچشمے سے کسبِ فیض کرتا ہے، جب وہ حرف اور معانی کے رشتہ ہائے آہن کا ادراک حاصل کرتا ہے، جب اس کی شخصیت میں تنوع پسندی کے رنگ باتیں کرتے ہیں اور جب فکر و نظر کے نئے امکانات دریافت کرنے کے باوجود اسے یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ

ع　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا___

امجد کو اس امر کا احساس ہے کہ آنکھوں کے بازار میں تل دھرنے کی جگہ نہیں، پھر بھی وہ اپنے خوابوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں___ اسے یقین ہے کہ ان کا سوز وغنا شہر کے پتھر دلوں کو دھڑکا دے گا___ امجد چوں کہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہے اور شاعر ہمیشہ آدرش پرست ہوتے ہیں۔اس لیے اسے خوش گمانی ہے کہ معاصر نقاد اسے قسط، قسط نہیں پڑھیں گے اور نہ ہی اصل عبارت کو ''پس نوشت'' ہونے دیں گے___

حوالہ جات:

۱۔　ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، انتخاب زریں-اُردو نظم، (لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۳
۲۔　ن-م راشد، ''مقدمہ''، نقشِ فریادی، طبع دوّم، (دلی: ہمالیہ بک ہاؤس، س-ن)، ص ۹
۳۔　امجد اسلام امجد، میرے بھی ہیں کچھ خواب، (لاہور: جہانگیر)، ص ۷۵
۴۔　ایضاً، ص ۳۳۰
۵۔　ایضاً، ص ۳۰۰-۳۰۱
۶۔　معراج انور خان، آزادی کے بعد اُردو شاعری میں فکری و فنی انحرافات، مقالہ برائے پی ایچ-ڈی، اُردو، شعبۂ اُردو، (علی گڑھ یونیورسٹی، انڈیا، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۵۲
۷۔　امجد اسلام امجد، برزخ، (لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۶ء)

۸۔ سعود عثمانی، اسلم کولسری، فواذ نیاز (مرتبین) ستارے مرے ہم سفر، دوحہ، قطر، مجد، ۔۔۔۔۔۔۲۰۰۴ء، ص ۱۳۵

۹۔ امجد اسلام امجد، میرے بھی ہیں کچھ خواب، ص ۱۸۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۰

۱۱۔ سعود عثمانی، اسلم کولسری، فواذ نیاز (مرتبین) ستارے مرے ہم سفر، ص ۱۲۷

۱۲۔ امجد اسلام امجد، میرے بھی ہیں کچھ خواب، ص ۳۱۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۶۳

۱۵۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، (کراچی: انجمن ترقیِ اُردو، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۶۷

۱۶۔ امجد اسلام امجد، میرے بھی ہیں کچھ خواب، ص ۵۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۳۹

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۲۶-۲۲۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۵

۲۰۔ منور اختر، امجد اسلام امجد کا فکر و فن "خزاں کے آخری دن" کے آئینے میں، تحقیقی مقالہ برائے ایم-اے، اردو، (پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۴ء-۲۰۰۶ء)، ص ۴۵

۲۱۔ امجد اسلام امجد، میرے بھی ہیں کچھ خواب، ص ۲۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۱۰

مآخذ:

۱۔ امجد اسلام امجد، برزخ، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔

۲۔ امجد اسلام امجد، میرے بھی ہیں کچھ خواب، لاہور: جہانگیر۔

۳۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، انتخاب زریں-اُردو نظم، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۷ء۔

۴۔ سعود عثمانی، اسلم کولسری، فواذ نیاز (مرتبین) ستارے مرے ہم سفر، دوحہ، قطر، مجد، ۔۔۔۔۔۔۲۰۰۴ء۔

۵۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۲۰۰۲ء۔

۶۔ ن-م راشد، "مقدمہ"، نقشِ فریادی، طبع دوّم، دلی: ہمالیہ بک ہاؤس، س-ن۔